درس حدیث

افادات : مولانا سمیع الحق

ضبط و ترتیب : مولانا اصلاح الدین ڈیروی
شریک دورۂ حدیث دارالعلوم حقانیہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا سفر آخرت

مرض وفات اور تجہیز و تکفین کی تفصیلات

استاد محترم سمیع الحق صاحب کے شمائل ترمذی کے درس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات "باب وفات النبی صلی اللہ علیہ وسلم" سے متعلق افادات کو احقر نے بغرض افادۂ عام دوران درس ضبط کیا اور اب اسے مرتب کر کے نذر قارئین کر رہا ہوں۔ (اصلاح الدین ڈیروی)

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اکثر محدثین کی رائے یہ ہے کہ یہ سانحہ ۱۲ ربیع الاول ۱۰ ہجری کو پیش آیا۔ بعض کے نزدیک حضورؐ کے وصال کی یہ تاریخ غلط ہے۔ ان کے اختلاف کا سبب تقویم کے بعض ماہرین کا وہ اعتراض ہے جو وہ اس تاریخ پر کرتے ہیں کہ ۱۰ ہجری حجۃ الوداع کے موقعہ پر ۹ ذی الحجہ کو بالاتفاق جمعہ شریف کا دن تھا۔ اور اگر یہ صحیح ہے تو کسی صورت میں بھی ۱۲ ربیع الاول کو پیر کا دن نہیں پڑتا۔ خواہ بعد کے تین مہینے تیس دن کے ہوں یا ۲۹ کے یا بعض تیس اور انتیس کے۔ جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت بالاتفاق پیر کے روز ہوئی ہے۔ اس لئے بعض محققین کا کہنا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ۲ ربیع الاول کو ہوئی اور بعض لوگوں نے ۱۲ ربیع الاول کی تاریخ میں تاویلات کا سہارا لیا ہے۔

آغاز مرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرض وفات کی ابتداء دردِ سر سے ہوئی۔ شدید گرمی کا موسم تھا۔ حضورؐ ایک جنازہ میں شرکت فرما رہے تھے کہ سر میں درد ہونے لگا۔ پھر بخار نے آ لیا۔ اس مرض کی ابتداء حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں ہوئی۔ لیکن حضورؐ کو تقسیم اور ازواج کے درمیان عدل کا اتنا پاس تھا کہ شدید بیماری کی حالت میں بھی باری باری چارپائی کو ازواج مطہرات کے حجروں میں پھروانے کا حکم دیا۔ تاکہ کسی بیوی کی حق تلفی نہ ہو۔ ازواج مطہرات میں بھی ہر ایک کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ بیماری کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس رہیں تاکہ وہ بھی ان کی تیمارداری اور خدمت کا شرف حاصل کر سکیں۔

حضرت میمونہ رضی کے گھر میں آپؐ کی تکلیف میں اضافہ ہوا۔ حالت بیماری میں ادھر ادھر پھرانے سے حضورؐ کو بھی تکلیف ہوتی تھی۔ نیز ہر وقت جگہ اور تیمارداروں کی تبدیلی مرض میں مزید شدت کا باعث بنتا تھا۔ لہذا تمام ازواج مطہرات نے آپس میں مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ چونکہ قلبی محبت کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کا قلبی اطمینان حضرت عائشہ رض کے حجرے میں زیادہ ہوتا ہے اس لئے روز روز قیام گاہ بدلنے کی بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیماری میں مستقلاً حضرت عائشہ رض کے حجرہ میں رہیں۔ چنانچہ آپؐ نے مرضِ وفات کے بارہ یا چودہ دن اسی حجرے میں گذارے۔

بے پناہ صبر و استقامت | ہر شخص کی موت اندوہناک اور افسوس ناک ضرور ہوتی ہے مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موت تو روزِ اول سے لے کر آج تک امت کے لئے ایک دردناک اور عظیم ترین سانحہ شمار ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ انسان جتنا بھی عظیم ہوتا ہے موت کے وقت اس کی عظمت کے اتنے ہی مظاہر سامنے آتے ہیں چنانچہ وہ تحمل، حوصلہ، صبر و شکر اور مصائب و شدائد کی برداشت کا اس نازک ترین موقعہ پر مظاہرہ کرکے اپنی عظمت کا ثبوت دیتا ہے۔ حضرت مولانا آزاد مرحوم نے عظیم لوگوں کی وفات کے متعلق الہلال میں " انسانیت موت کے دروازے پر" کے عنوان سے ایک سلسلہ شروع کیا تھا جس میں عظیم لوگوں کی وفات کے احوال لکھے ہیں۔ اس کتاب میں مولانا نے حضورؐ کے سانحۂ ارتحال کے احوال بہت مؤثر اور دردناک انداز میں لکھے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں نے وفات اور مرضِ وفات کے بارے میں بڑے پُر درد اور پُرسوز پیرائے میں کتابیں لکھی ہیں۔

امام ترمذی بھی اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موت، مرضِ وفات کے شدائد اور اس موقع پر حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے اطمینان اور صبر و سکون کا ذکر کرتے ہیں۔ پھر وفات کے بعد جنازے اور کفن دفن کے حالات بیان کرتے ہیں جس سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ صحابہ کرام رض کو اللہ تعالیٰ نے کیسے حالات سے نوازا تھا اور کیسے انہوں نے استقامت سے اس سانحۂ کبریٰ کا استقبال کیا۔ اور کتنے لوگ تھے جو فرطِ غم سے حواس گم کر بیٹھے تھے۔

اس موقع پر صدیق اکبرؓ کا کردار | پھر یہ بھی معلوم ہوگا کہ ابوبکر صدیق رض کا مقام صحابہ کی نگاہ میں کیسا ہے؟ عموماً جب کوئی آدمی مرجاتا ہے تو لوگ کفن دفن کے لئے اس کے جانشینوں سے رجوع کرتے ہیں۔ مگر حضورؐ کا معاملہ اور تھا آپ کی بیٹی، داماد، چچا زاد بھائی اور قوم قبیلہ کے لوگ موجود تھے۔ ازواج مطہرات موجود تھیں۔ مگر ساری امت کا مرجع ابوبکر صدیق رض ہی بنتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب بھی تجہیز و تکفین کے بارہ میں کوئی نزاع پیدا ہوجاتا ہے یا کوئی مسئلہ پیش آتا ہے تو لوگ حضرت صدیق رض کے پاس آتے ہیں اور وہ جو بھی فیصلہ دیتے ہیں لوگوں کی طرف سے " صَدَقتَ " اور " قد صدق " کی صدا سنائی دیتی ہے۔ اس سے اس بات کو بھی اشارہ ہوجاتا ہے کہ خیر القرون میں حکومت و مملکت، نسلی اور وراثت کی چیز نہ تھی۔ بلکہ صحابہ کرامؓ میں حضورؐ سے قریب ترین اور سب سے افضل ترین امیر اور خلیفہ بن جاتا ہے۔ نیز اس سے صحابہ رض کے درمیان ابوبکر صدیق رض کا مقام بھی بخوبی واضح ہوجاتا ہے۔

امت سے آخری ملاقات | **حدثنا** ابو عمار الحسین بن حریث (الی قولہ) عن انس بن مالک

قال آخر نظرة نظرتها الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کشف الستارة یوم الاثنین فنظرت الی وجهه الخ

حضرت عائشہ رضؓ کے حجرے کا دروازہ مسجد نبویؐ کی طرف کھلتا تھا۔ آپ نے مرض وفات میں دروازے پر سے پردہ اٹھا کر دیکھا کہ سب صحابہ رضؓ سربسجود ہیں۔ حضرت صدیق رضؓ امامت فرما رہے ہیں۔ امت کے ساتھ حضورؐ کی یہ آخری ملاقات تھی ——— کتنی عظیم نعمت ہے کہ اللہ تعالیٰ آپؐ کی زندگی کے آخری لمحات میں آپ کو سکون و اطمینان دلانے کے لئے یہ منظر دکھلا رہے ہیں۔ گویا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتانا چاہتے ہیں کہ آپ نے امت کے لئے جتنی محنتیں برداشت کیں۔ جو تکالیف اور مصائب امت کے لئے جھیلیں وہ رائیگاں نہیں گئیں۔ اور توحید کا جو پودا آپ نے آج سے تئیس سال قبل بویا، اسے سینچا اور اس کی نشوونما میں جانکاہ مصائب سہے بالآخر وہ ثمر آور ہوا۔ یہی لوگ ہی تو تھے جو لات، منات اور عزیٰ کے قدموں میں پڑے تھے۔ جہالت اور صنم پرستی کے ظلمات میں سرگرداں ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ مگر آج اللہ کے ہاں سربسجود ہیں۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے ہاں آخری گواہی بھی یہی دے سکیں گے کہ اے اللہ میں نے ان لوگوں کو ہر طرف سے کاٹ کر تیری بارگاہ میں جھکا ہوا چھوڑا تھا۔ اور وہ سربسجود تھے۔ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ پھر اس کے بعد اے اللہ تو ہی ان کا نگران رہا

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ کہ حضورؐ نے باہر جھانک کر دیکھا۔ اور میں نے چہرۂ انور کو دیکھا کہ کانّہ ورقۃ مصحف۔ بلیغ کلام اور بے نظیر تشبیہ ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کے نورانی صفحہ کے ساتھ چہرۂ انور کو تشبیہ دی ہے۔ گویا جس طرح قرآن مجید کے اوراق میں انوار ہوتے ہیں۔ اور ان انوار کا کماحقہٗ احساس بھی صحابہ ہی کو ہو سکتا ہے۔ اسی طرح نبی کریمؐ کا چہرہ مبارک انوار الٰہی وقار و بشاشت اور اطمینان و سکون کی وجہ سے دمک رہا تھا۔ اور اس تشبیہ سے غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صبر و شکر اور اس طمانیت کی نشاندہی ہے جو امت کو ایسی حالت میں دیکھ کر رسول اللہ کے چہرہ سے عیاں تھی۔ نیز مسرت کی اس کیفیت کا پتہ بھی خوب چلتا ہے جو رفیق اعلیٰ سے ملنے کے تصور سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہو رہی تھی۔

امامت ابی بکرؓ | والناس یصلون خلف ابی بکر فکاد الناس ان یضطربوا فاشار الی الناس ان اثبتوا و ابوبکر یومھم۔ حضورؐ نے پردہ اٹھایا تو صحابہؓ سمجھے کہ شاید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لا رہے ہیں۔ چنانچہ ان میں کھلبلی مچی۔ مگر حضورؐ نے لوگوں کے اضطراب کو محسوس کر کے اطلاع دی کہ میں نہیں آ رہا۔ اس لئے صفوں کو نہ توڑو۔ اپنی نماز پوری کرو۔ اس بات میں حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی امامت کی تقریر و تائید بھی ہے۔ اور یہ اشارہ بھی کہ آئندہ بھی ان کی اقتداء و اتباع میں راسخ قدم رہو۔

مخالفین و معاندین، سازشی اور منافقین ڈگمگاہٹ پیدا کرنے کی بارہا کوشش بھی کریں اور عظمت ابوبکرؓ اور ان کی خلافت کے بارے میں لب کشائی بھی کرتے رہیں مگر تم ثابت قدم رہو اور اجتماعیت کو برقرار رکھتے ہوئے ثبات اختیار کرو۔

وانقی السجف وتوفی من آخر ذالک الیوم۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس روز کے آخر میں وفات پا گئے۔ مگر اس پہ اشکال وارد ہوتا ہے۔ کہ قوی روایات کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چاشت کے وقت رحلت فرمائی۔ جن کو مدنظر رکھتے ہوئے آخر الیوم کا لفظ درست نہیں بنتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آخر کا اطلاق کبھی کبھی دخول فی النصف الثانی پر بھی ہوتا ہے۔ اور ضحوۂ کبریٰ یعنی چاشت کا وقت بھی زوال کے قریب ہے۔ گویا ضحوۂ کبریٰ کو قرب کی وجہ زوال کہا گیا۔ پھر زوال سے آخر الیوم کا لفظ کہہ کر تعبیر کی گئی۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ آخر کا لفظ کبھی مقحم بھی آتا ہے جس طرح عین کا لفظ کبھی مقحم اور زائد مستعمل ہوتا ہے۔ تو یہاں بھی آخر کا معنی مقصود و مراد نہ ہوگا بلکہ یہ کہ حضورؐ اسی دن انتقال فرما گئے۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ حضورؐ چاشت کے وقت انتقال فرما گئے۔ لیکن کسی کو آپؐ کی وفات کا یقین نہ آیا۔ خصوصاً حضرت عمرؓ تو آپؐ کی موت کے بارے میں سننے کے لئے بھی تیار نہ تھے۔ پھر حضرت ابوبکرؓ نے یہ عقدہ حل فرمایا۔ مگر آپ کے فیصلہ کا علم اکثر صحابہؓ کو اس وقت ہوا جب دن کا بیشتر حصہ گذر چکا تھا۔ یوں لوگ سمجھنے لگے کہ آخر النہار میں حضورؐ کی وفات ہوئی تھی۔

حدثنا محمد بن سعدۃ (الی قولہ) عن عائشۃ قالت کنت مسندۃ النبیؐ الی صدری او قالت الی حجری فدعا بطست لیبول فیہ **الخ** شدید بیماری اور انتہائی ضعف ونقاہت کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم صفائی اور نظافت کا بہت زیادہ اہتمام رکھتے تھے حتیٰ کہ چارپائی سے اتر نہیں سکتے۔ مگر پھر بھی چلمچی جیسا کوئی برتن منگوایا اور پردہ کرا کر بول کیا۔

فمات اس کا مطلب یہ نہیں کہ حضورؐ عین اسی حالت میں انتقال کر گئے۔ مگر چونکہ اس حدیث میں حضورؐ کے ضعف کا بیان مقصود تھا اس وجہ سے مرض وفات کے دیگر حالات و واقعات بیان نہیں فرمائے۔ حضورؐ کے ضعف کے بیان کے ساتھ ساتھ اس حدیث میں حضرت عائشہؓ کی عظمت رتبی کو بھی اشارہ ہے کہ نبی کریمؐ اپنے آخری سانسوں میں آپ ہی کی گود کا سہارا لئے ہوئے تھے۔ اور یہ عظیم اعزاز کسی اور کو حاصل نہ ہوا۔

حدثنا قتیبہ (الی قولہ) عن عائشۃ انہا قالت رایت رسول اللہؐ وھو بالموت وعندہ قدح فیہ ماء الخ

وھو بالموت بالموت کا متعلق محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے وھو مشرف بالموت یعنی آنحضرت موت کے قریب تھے

ویمسح وجھہ بالماء بعض اوقات جب بخار انتہائی سخت ہو جاتا ہے تو تبرید کے ذریعے مریض کو آرام پہنچایا جاتا ہے۔ آج کل بھی ایسا اوقات بعض بخار میں ڈاکٹر اس پہ عمل کرتے ہیں۔ اور خود حضورؐ سے یہ مروی بھی ہے۔ فرماتے ہیں "ان الحمی من فیح جہنم فابردوھا بالماء (ترمذی جلد ۲ صہ ۲۷) نیز فرمایا" الحمی فور من النار فابردوھا بالماء (ایضاً)

یعنی شدید بخار جہنم کے بھڑاس میں سے ہے اسے پانی سے ٹھنڈا کر دیا کرو۔

حضورؐ کے سکرات موت اللھم اعنی منکرات الموت او قال علی سکرات الموت۔ منکرات سے وہ ناآشنا اور غیر معروف حالات مراد ہیں۔ جو موت کے وقت انسان کو پیش آتے ہیں اور اس سے قبل انسان کا اس سے واسطہ نہیں پڑتا۔ عموماً ایسی حالت میں آدمی غفلت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور جزع و فزع میں آخرت اور رضائے الٰہی بھول جاتا ہے۔ چنانچہ ایسے سخت ترین اور خطرناک حالات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ثبات و استقامت کی دعا فرمائی۔ کہ اے اللہ اس مرض میں مجھ سے خلاف شرع امور سرزد نہ ہوں۔ موت کے وقت کبھی بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے کبھی افاقہ ہوتا ہے۔ اس کیفیت کو سکرات الموت کہا جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ موت کے وقت شدائد و تکالیف سے دوچار ہونا مبغوضیت کی علامت نہیں۔ ہمارے ہاں بسا اوقات اس شخص کو بدبخت اور گناہ گار تصور کیا جاتا ہے جس کے سکرات موت سخت اور طویل ہوں مگر یہ غلط ہے بلکہ درحقیقت سیئات اور خطایا کی کمی پورا کرنے، درجات کی بلندی اور مقامات عالیہ عطا کرنے کی خاطر مقربین اور اولیاء اللہ پر یہ تکالیف اور شدائد زیادہ آتے ہیں۔ گویا سکرات الموت کی شدت اللہ تعالیٰ کے دربار میں عدم قبولیت کی دلیل نہیں۔ ورنہ سید المخلوقات رسول اللہؐ سے زیادہ محبوب اور کون ہو سکتا ہے، تو اس لطف و مہربانی کے زیادہ حقدار بھی وہی ہو سکتے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی رحلت کو اس معاملہ میں بھی دنیا کے سامنے ایک قابل تقلید نمونہ بنایا کہ شدائد موت میں آہ و فغاں کی بجائے صبر سے کام لینا چاہئے۔ اور استقلال کا دامن مضبوطی سے تھام کر تسہیل و تخفیف کی دعا کرنی چاہئے۔ اور یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اچانک آنے والی موت سے پناہ مانگی ہے۔ چنانچہ عمرو بن العاص کی روایت ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استعاذ من سبع موتات۔ موت الفجاءۃ ومن لدغ الحیۃ ومن السبع ومن الحرق ومن الغرق ومن ان یخر علی شیئ او یخر علیہ شیئ ومن القتل عند فرار الزحف (مسند احمد ج ۲ ص ۱۷۱)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سات قسم کی موتوں سے پناہ مانگی ہے۔ اچانک آنے والی موت سے اور سانپ کے ڈسنے سے۔ درندوں کی چیر پھاڑ سے۔ جلنے سے۔ ڈوبنے سے۔ کسی چیز پر گر کر مرنے یا کسی چیز کا اس پر گر جانے سے اور جنگ سے بھاگتے ہوئے قتل ہونے سے۔ کیونکہ ایسے حالات میں سوچنے، توبہ کرنے، اللہ کے حضور گڑگڑانے اور وصایا کرنے کا موقعہ میسر نہیں آتا۔

حدثنا الحسن بن الصباح (الی قولہ) عن عائشۃ قالت لا اغبط احدا بھون موت الخ

مطلب یہ ہے کہ اس سے قبل تو ہم سکرات موت میں تخفیف کی وجہ سے بعض لوگوں پر رشک کیا کرتے تھے۔

اور یہ تمنا کرتے کہ کاش فلاں شخص جیسی آسان موت نصیب ہو۔ مگر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کی سختی، شدائد اور کرب و آلام نظر آئیں تو کسی کی مرض الموت میں تکلیف ہونے پر رشک و غبطہ کی تمنا نہ رہی۔ اس حدیث میں بھی حضورؐ کے سکرات موت کی شدت کو اشارہ ہے۔ لہذا موت کی تہوین و تخفیف کو کرامت سمجھنا خام خیالی ہے۔ کیونکہ شدت مرض گناہوں کی معافی اور استغفار، موت کے استحضار اور رفع درجات کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی یاد رہے کہ یہ شدت و پریشانی مقدمات موت کی وجہ سے ہے۔ عین موت کی وجہ سے حضورؐ کو کوئی رنج و پریشانی نہ تھی۔ بلکہ آپ تو رفیق اعلیٰ کے وصال کے لئے پہلے سے تڑپ رہے تھے۔ موت کے وقت بھی وصال کا تصور کر کے مسرت و بشاشت ظاہر ہو جاتی تھی۔

تدفین میں اختلاف | حدثنا ابو کریب (الی قولہ) عن عائشۃ قالت لما قبض النبی صلی اللہ علیہ وسلم اختلفوا فی دفنہ الخ یہ بات ذہن نشین رہے کہ صحابہ کرامؓ عام اور معمولی باتوں میں اختلاف سے گریز فرماتے۔ لیکن رحمۃ للعالمین کی رحلت کی موت عام انسان کی موت نہ تھی۔ بنی اسرائیل میں انبیاء کثرت سے گذرے ہیں اور متعدد بار انہوں نے انبیاء کی تدفین اپنے ہاتھوں سے کی۔ اس لئے یہ بات ان کے ہاں کسی غیر معمولی واقعہ کی حامل نہ تھی۔ اس کے برعکس حضورؐ کی بعثت امیین میں ہوئی تھی اور انہوں نے نبی کی موت کے بارے میں سنا بھی نہ تھا۔ وہ اس بات کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ ایسی مقدس ہستی پر خاک ڈال دیں۔ وہ حیران تھے کہ نبی کیسے وفات پاتا ہے؟ اور وفات کے بعد اس سے کیا رویہ برتا جاتا ہے؟ اسے دفنایا بھی جاتا ہے یا نہیں؟ اور پھر کہاں پر دفنایا جائے گا؟ جنازہ بھی ہوگا یا نہیں؟ اور کون دل گردے کا مالک نبی پر جنازہ پڑھے گا؟ پھر جنازہ اجتماعی ہوگا یا انفرادی؟ یہ اور اس قسم کے سوالات کی وجہ سے وہ ششدر و پریشان تھے۔ اور الجھنوں میں پڑتے رہے۔ ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے صدیق الامت کے دل میں عزم و استقلال کا مادہ پیدا کر دیا۔ امت کے اس مونس و غمخوار نے صحابہ کی تسلی اور پریشانی مٹانے کا یہ کٹھن کام اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

فقال ابو بکر جس طرح پہلے گذر چکا ہے کہ اختلاف کی متعدد جہات تھیں۔ یہاں صرف تدفین کے مقام میں اختلاف کا ذکر ہے۔ آپؐ کے مدفن کے بارے میں مختلف آراء سامنے آئیں۔ کوئی جنت البقیع کا نام لیتا۔ کوئی آپ کے گھر کو ترجیح دیتا۔ کوئی مسجد میں دفن کرنے پر مصر تھا کسی کی رائے یہ تھی کہ آپؐ اپنے مولد یعنی مکہ مکرمہ میں مقام ابراہیم یا حطیم میں دفن کرنا چاہئے۔ کوئی کہتا کہ چونکہ آپ ملت ابراہیمی کے امام و مجدد ہیں۔ اس لئے اپنے جد امجد کے پاس انہیں "الخلیل" میں دفن ہونا چاہئے۔ جہاں حضرت ابراہیمؑ کے علاوہ حضرت اسحاقؑ، حضرت یوسفؑ اور دیگر جلیل القدر انبیاء مدفون ہیں۔ آج کل اس شہر کو حبرون بھی کہا جاتا ہے جو بدقسمتی سے اسرائیل کے جدید مقبوضہ

علاقوں میں شامل ہے۔ بعض دوسرے صحابہؓ کے خیال میں بیت المقدس لے جانا بہتر تھا۔

الغرض ہر کوئی اپنا خیال پیش کرتا۔ ابوبکرؓ تک بات پہنچی تو آپ نے یہ گتھی سلجھا دی۔ اور اس سلسلے میں حضورؐ کا یہ قول پیش کر دیا کہ نبی کو وہاں دفن کیا جاتا ہے جہاں اس کی موت واقع ہوتی ہے۔

واضح رہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے مزاج اور عادت کی وجہ سے روایت کے سلسلے میں بہت محتاط تھے۔ بلاضرورت روایت کرنے سے کتراتے تھے۔ اور اس کا سبب ظاہر ہے۔ وہ یہ کہ آپ احادیث کی بہت زیادہ تعظیم و احترام کرتے اور ادب ملحوظ رکھتے کہ کہیں بے احتیاطی نہ ہونے پائے۔ تاہم جب ضرورت پڑتی تو خاموش تماشائی بھی نہ بنتے۔ خصوصاً امت کے نزاع کے وقت آپ کی روایت فیصل اور حکم بنتی۔

مدفن نبی کا انتخاب خدائی ہوتا ہے	ما قبض اللہ نبیًّا الّا فی الموضع الذی یحب ان یدفن فیہ ادفنوہ فی موضع فراشہ پیغمبر کی روح اللہ تعالیٰ جس جگہ قبض فرماتے ہیں وہی جگہ مدفن کے لئے بھی منتخب فرما چکے ہوتے

ہیں۔ گویا حضورؐ نے خود ہی اس قول کے ذریعے فیصلہ دے دیا کہ جس حجرہ میں ہیں وہیں دفن کر دو۔ اتفاق سے وہ حجرہ سیدہ عائشہ رضؓ کا تھا۔ اور سب نے اس حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ کسی نے بھی لب کشائی نہ کی۔ یہ بھی نہ کہا کہ حضرت فاطمہ رضؓ کا حجرہ قریب ہے یا حضرت علی رضؓ کے گھر دفن ہونا چاہئے۔ نیز یہ بدگمانی بھی کسی نے نہ کی کہ ابوبکر صدیق رضؓ نے اپنی بیٹی کو یہ شرف دلوانے کے لئے کوئی بات بنائی ہوگی۔ (العیاذ باللہ)

بعد کے معاندین اہل رفض نے ان ساری باتوں میں الزامات اور بدگمانیوں کا بازار گرم کیا۔ اس موقعہ پر اہل بیت، ازواج مطہراتؓ، حضرت علی رضؓ، حضرت فاطمہ رضؓ اور سب صحابہ رضؓ نے اپنے رہبر و مقتدا حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کا قول فیصل بلا چون و چرا تسلیم کر لیا۔ اگر شیعہ موجود ہوتے تو یہ الزام اس وقت بھی لگاتے۔ کہ صدیق نے یہ سب کچھ اقربا پروری کے لئے کیا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہؓ کو دیگر تشریفات کے علاوہ اس شرف سے بھی مشرف کرنا تھا۔ چنانچہ صحابہ رضؓ میں سے کسی نے بھی اس پر انکار نہ فرمایا۔

یہاں سے یہ بات بھی بخوبی واضح ہوگئی کہ نبئ برحق کو اللہ تعالیٰ کبھی بھی غیر معززؔ مقام میں وفات نہیں ہونے دیتے۔ ہاں جو جعلی اور بناوٹی نبی ہو اسے بیت الخلاء میں مرنا نصیب ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ مرزا غلام احمد جیسے دجال کی تکذیب کے لئے یہ حدیث بھی کافی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اس جگہ کسی نبی کی روح لیتے ہیں جس جگہ اسے دفن کرنا مقصود ہو۔ جب کہ اس کذّاب کو ہم دیکھتے ہیں کہ اسے لاہور میں علاج کے لئے لایا گیا تو لاہوری مرزائیوں کی بلڈنگ میں اقامت کے دوران اسے سخت ہیضہ نے آلیا۔ جب قضائے حاجت کے لئے گیا تو بیت الخلاء میں ہی جہنم واصل ہوا۔ چشم دید گواہوں کے مطابق غلاظت اس کے منہ پر بھی لگی ہوئی تھی۔ اگر وہ معاذ اللہ واقعی نبی ہوتا تو حضورؐ کے اس قول کے مطابق تو اسے وہیں بیت الخلاء میں دفن کرنا تھا اور قادیاں لے جانے کا کوئی جواز نہ تھا۔

ابوبکرؓ کا بے پناہ صبر و استقامت

حدثنا محمد بن بشار (الی قولہ) عن ابن عباس و عائشۃ ان ابابکر قبل النبی بعد ما مات۔ حضور پرنور کی رحلت کے وقت حضرت ابوبکرؓ موجود نہ تھے۔ اکثر تو مرض وفات میں وہ حاضر رہے مگر زراعت اور کاروبار کی غرض سے انہیں دور جانا پڑتا۔ وفات سے کچھ قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت کچھ بہتر ہوئی۔ آپ اپنی زمین کے انتظام کی خاطر ایک میل دور مقام سنح کی طرف چلے گئے تھے۔ ادھر حضورؐ کی بیماری بڑھ گئی۔ دوپہر کے وقت آپ اپنی مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ حضرت سالمؓ نے یہ دلدوز خبر سنائی۔ آپ نے فوراً سب کچھ چھوڑ کر ادھر کا رخ کیا۔ مسجد نبویؐ پہنچے تو صحابہ کی اشکبار آنکھوں نے آپ کا استقبال کیا۔

تمام صحابہ غم و الم میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ حضرت فاروقؓ تلوار سونتے ہوئے کھڑے ہیں۔ اور کہہ رہے ہیں کہ جس نے حضورؐ کی موت کے بارے میں لب کشائی کی، تو اس کی گردن اڑا دوں گا۔ اس عظیم سانحہ نے سب کے حواس معطل کر دئے تھے حوصلہ اور استقامت صدیقؓ ہی کا کام ہو سکتا تھا۔ چنانچہ وہ آئے۔

اگلی حدیث میں آئے گا کہ حضورؐ پر صحابہؓ کا ہجوم تھا۔ چھوٹا سا حجرہ کچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ حضرت صدیقؓ آئے تو سب نے راستہ بنا کر صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری دیدار کا موقعہ دیا۔ چنانچہ آپ حضورؐ کے پاس آئے۔ بے پناہ قوت برداشت اور تحمل کے باوجود اس وقت عشق و وارفتگی سے بے بس ہو کر پیشانی مبارک کو الوداعی بوسہ دیا۔ اور وانبیاہ و اصفیاہ و اخلیلاہ کے الفاظ منہ سے نکلے۔

ابوبکرؓ پر فراق نبوی کے اثرات

مورخین حیران ہیں کہ ابوبکرؓ اتنے عشق کے باوجود اتنا ضبط کیونکر کر سکے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ صدیقؓ کو اس صدمہ نے اندر ہی اندر پگھلا کر رکھ دیا۔ آپ ہجر کے اس صدمے سے جانبر نہ ہو سکے۔ اور دو اڑھائی سال بعد اپنے محبوب سے جا ملے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے "مات من کمد لحقہ من هجر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم"

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جب حضورؐ نے عین حیات ہی میں ایک موقعہ پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا "ان عبداً خیرہ اللہ بین ان یوتیہ من زهرة الدنیا ماشاء و بین ما عندہ فبکی ابوبکر" تمام صحابہ بیٹھے ہیں اور اس قصہ کو دوسری ایک قصہ سمجھ بیٹھے مگر صدیقؓ پر نبیؐ کا عکس پڑتا ہے وہ سمجھ گئے کہ نبی کریمؐ کا مقصد دوسرے نبی کی حکایت بیان کرنا نہیں بلکہ وہ اپنی بات کر رہے ہیں۔ اس لئے آپ دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ اور کہا "فدیناك بآبائنا و امهاتنا" لوگوں نے کہا اس بوڑھے کو دیکھو کہ حضورؐ کسی اور کی بات کرتے ہیں اور یہ رونے لگے۔ نبی کریمؐ سمجھ گئے کہ صدیقؓ بات کی تہہ تک پہنچ گئے ہیں۔ اس لئے فرمایا "علی رسلك یا ابابکر" پھر فرمایا "ان من امنّ الناس

علیٌ فی صحبتہٖ و مالہ ابوبکر (متفق علیہ) اور فرمایا لو کنت متّخذاً خلیلاً لاتخذت ابابکر خلیلاً الا وان صاحبکم خلیل اللہ (ترمذی)

مقام صدیقؓ | اس والہانہ عشق و محبت کے باوجود وفات النبیؐ کا تصور کرکے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو قوتِ برداشت اور صبر و تحمل کا مظہر بنا دیا تاکہ دکھی دلوں کو ایک دلاسہ دینے والا مونس و غم خوار مل جائے۔ اور بلا شبہ نیابتِ رسالت کا منصب اسی شخص کے شایانِ شان ہے جس کے بارے میں خود حضورؐ نے فرمایا میں نے ہر شخص کے احسانات کا بدلہ دے دیا ہے۔ صرف ابوبکرؓ کے احسانات کا بدلہ میں نے آخرت کے لئے مؤخر کر دیا ہے۔

اقبالؒ اپنے الہامی کلام میں حضورؐ کے نزدیک صدیقؓ کے مرتبے کی یوں تصویر کشی کرتے ہیں ؎

آں امن النّاس بر مولائے ما   آں کلیم اوّل سینائے ما

اور حضرت حسان بن ثابتؓ شاعر رسولؐ نے ایک موقعہ پر ابوبکرؓ کی شان میں کیا عجیب مدحیہ اشعار کہے فرماتے ہیں ؎

خیر البریۃ اتقاھا و اعدلھا   بعد النبی و اوفاھا بما حملا

و ثانی اثنین فی الغار المنیف وقد   طاف العدو بہ اذ صعد الجبلا

و کان حب رسول اللہ قد علموا   من البریۃ لم یعدل بہ رجلا

بہر حال صدیقؓ نے حضورؐ کو بوسہ دیا۔ اور اس میں حضورؐ کی اقتداء و تیمن کو بھی ملحوظ رکھا۔ خود حضورؐ سے یہ سنّت ثابت ہے۔ چنانچہ حضرت عثمان بن مظعونؓ جب وفات پا گئے تو نبی کریمؐ نے ان کی پیشانی کو بوسہ دیا تھا۔

حدثنا نصر بن علی الجھضمی (الی قولہ) عن عائشۃ ان ابابکرؓ دخل علی النبیؐ بعد وفاتہ فوضع فمہ بین عینیہ ووضع یدیہ علی ساعدیہ وقال وانبیاہ واصفیاہ واخلیلاہ

حضورؐ کے دونوں بازوؤں پر ہاتھ رکھ کر حضرت ابوبکرؓ نے پیشانی مبارک کو بوسہ دیا اور فرمایا۔ ہائے نبیؐ۔ ہائے اللہ کے صفی ہائے میرے دوست۔ اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ حقیقی اوصاف کا لحاظ کرکے میت کو وا اور یا سے پکارنا جائز ہے مگر یہ الفاظ صدیق اکبر نے نوحہ کے طور پر نہیں کہے تھے۔ باقی تشریح پہلے گذر چکی ہے۔

حضورؐ کی تدفین سے انوار میں کمی | **حدثنا بشر بن ھلال الصواف** (الی قولہ) عن انس قال لما کان الیوم الذی دخل فیہ رسول اللہؐ المدینۃ اضاء منھا کل شیء الخ

حضور اقدسؐ جس دن مدینہ طیبہ تشریف لاتے تھے تو سارا شہر ظاہری و باطنی خوشیوں کی آماجگاہ بن گیا تھا انوار کی بارش سے یہ چیز ہر ایک کو محسوس ہو رہی تھی اور حضورؐ کی آمد سے سارا عالم منور ہو گیا تھا۔ تو مدینہ کے

چھوٹے بڑے سب مسرور تھے۔ بچے خوشی میں دف بجا بجا کر گاتے ہ

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع   وجب الشکر علینا ما دعا للہ داع

اس سے پہلے اہل مدینہ دس پندرہ روز تک انتظار کی شدید کیفیتوں سے دوچار رہے تھے۔ چھوٹے بڑے سب ثنیۃ الوداع میں جمع ہو کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار کرتے۔ اور حضورؐ کو نہ دیکھتے تو واپس آکر دوسرے دن استقبال کے لئے نکلتے۔ جس روز آپ مدینہ پہنچے تو مدینہ میں عید کی سی خوشی منائی گئی۔ صحابی فرماتے ہیں کہ حضورؐ کے قدوم میمنت سے سارا مدینہ منور ہو گیا۔ ہر چیز روشن ہو گئی۔ پھر جب دس سال بعد وہ مبارک ومقدس ہستی رخصت ہونے لگی۔ تو ہم لوگ وصال کے بعد تدفین سے فارغ ہو کر ابھی ہاتھ سے مٹی جھاڑنے بھی نہ پائے تھے کہ ہم نے دلوں کو بدلا ہوا پایا۔ ہر چیز اوپری سی لگ رہی تھی۔ یہاں تک کہ ہم نے اپنے دلوں کی کیفیت بھی ناآشنا اور متغیر محسوس کی۔ جیسے سورج ڈوبتے ہی ظلمتوں کا بحر محیط امڈ آتا ہے۔ اور ساری کائنات اوپری سی لگتی ہے۔ یونہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی کی وجہ سے جو انوار و اثرات اور وحی کی برکات تھیں وہ صاحب وحی کے اٹھتے ہی مفقود ہو گئیں۔ اور قلوب میں وہ صفائی اور نورانیت نہ رہی جو اس سے قبل تھی۔ کیونکہ حضورؐ کی موت کے بعد ہر لحظہ خیر میں کمی اور شر میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یہی اثر حضورؐ کی موت کے قریب ترین لمحات میں بھی رہا۔ جیسے صحابہ رضؓ کی حساس نظروں نے تاڑ لیا۔ پھر خیر القرون کے بعد تو ہر گذشتہ کل آج سے بہتر ہونے کا ثبوت مل گیا۔

ایک حکایت کے مطابق ایک صوفی شخص نے دکان کھولی جس میں تازہ روٹی ایک روپیہ اور باسی روٹی دو روپے میں بکتی تھی۔ مگر لوگ تازہ روٹی چھوڑ کر سوکھی روٹی خریدتے۔ کیونکہ وہ حضورؐ کے زمانے سے کچھ قریب ہوتی۔

حدثنا محمد بن حاتم (الی قولہ) عن عائشۃ قالت توفی رسول اللہ ؐ یوم الاثنین حضورؐ کا وصال پیر کے روز ہوا۔ یہ مسئلہ اجماعی ہے۔ کسی نے بھی اس میں اختلاف نہیں کیا۔

حدثنا محمد بن ابی عمر (الی قولہ) عن ابیہ قال قبض رسول اللہ ؐ الخ

تدفین میں تاخیر | فمکث ذالک الیوم پیر کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا۔ یہ دن انتظامات میں گذر گیا۔ پھر منگل کی رات اور منگل کا دن بھی گذر گیا۔ اور بدھ کی رات کو آپؐ کی تدفین ہوئی۔ لہذا دفن من اللیل کا معنی یہ ہوا کہ آپ کو لیلۃ الاربعاء میں دفن کیا گیا۔ گویا عبارت میں یہ ایجاز ہے اور یوم الثلثاء کے گذر جانے کا ذکر مراد ہونے کے باوجود نہیں کیا گیا۔

سنت اور افضل یہ ہے کہ میت کو جلدی دفن کر دیا جائے۔ لیکن خاص حالات اس سے مستثنیٰ ہیں۔ حضورؐ کی تدفین بھی کوئی معمولی بات نہ تھی۔ بلکہ وہ حالات کچھ ایسے تھے کہ ہر بات نئی ہونے کی وجہ سے جھگڑا پیدا ہونے

کا اندیشہ تھا۔ اس لئے غور فکر اور مشوروں کی ضرورت تھی۔ ادھر کفن دفن کے احکامات بھی ہر کسی کو معلوم نہ تھے۔ اور ان معاملات کو حضورؐ کی تدفین سے قبل ہی طے کرانا ناگزیر تھا۔ تاکہ تجہیز و تدفین میں وحدت و اجتماعیت برقرار رہے۔ اور تمام صحابہؓ اس میں شریک ہوں۔

پھر بدقسمتی سے خلافت کے مسئلہ میں اختلاف پیدا ہوا۔ جس کی اہمیت کا احساس صدیق اکبرؓ جیسے نباض امت اور عمر فاروقؓ جیسے صاحب فراست و سیاست ہی کو ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس کٹھن مرحلہ میں امت کو افتراق اور تشتت و انتشار سے بچانے کے لئے ابوبکر صدیقؓ اور دیگر اکابر صحابہؓ نے پہلے اس کی طرف توجہ دینا ضروری سمجھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ اختلاف قیامت تک امت کے لئے دردِ سر بنے گا۔

حضورؐ کی رحلت کے فوراً بعد صحابہؓ میں خلیفۃ الرسول کے بارے میں مشورے ہوئے۔ انصار نے سقیفہ بنو ساعدہ میں جمع ہو کر یہ مسئلہ چھیڑ دیا۔ ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کو اس بارے میں پتہ چلا اور محسوس کرلیا کہ اگر انصار اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگئے تو وحدت و اجتماعیت اور یکسوئی ختم ہو کر امت کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ چنانچہ وہ بھی اس مسئلے سے نمٹنے کے لئے سقیفہ بنو ساعدہ چلے گئے۔ اسی دوران انصار میں سے حضرت حباب بن منذر نے "منا امیر و منکم امیر" کا نعرہ لگا کر "ادھر تم ادھر ہم" کا نظریہ پیش کیا۔ مگر صدیقؓ کی فراست نے امت کی وحدت کی لاج رکھ لی۔ چنانچہ آپ نے انصار کو ایک مؤثر تقریر کے ذریعے سمجھایا۔ جس پر انصار کے مجمع نے لبیک کہا۔ حضرت عمرؓ نے وہیں آپ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ اور پھر دوسرے روز مسجد نبویؐ میں عمومی بیعت کے ذریعے تمام لوگوں نے صدیق اکبرؓ کو خلافت کا فریضہ سونپ دیا۔ اس کے بعد ہی تدفین کی طرف توجہ دینے کا موقعہ ملا جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ تدفین میں دیر ہوگئی۔

تاخیر کا ایک اور سبب یہ بھی تھا کہ نماز جنازہ اجتماعی طور پر نہیں ہوا تھا بلکہ صحابہ ٹولیوں کی صورت میں حجرہ میں جاتے اور نماز پڑھتے۔ اور یہ حجرہ بھی وہ حجرہ ہے جس میں حضورؐ تہجد پڑھتے تو حضرت عائشہؓ کے سونے کے لئے جگہ نہ ہوتی۔ حضورؐ سجدہ کو جاتے تو حضرت عائشہؓ پاؤں سمیٹ لیتیں، تب حضورؐ کے سجدے کے لئے جگہ بنتی۔ تو ایسے حجرے میں بیک وقت تین چار آدمی ہی نماز پڑھ سکتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ہزاروں عشاق کی نماز پڑھنے پر بہت وقت لگے گا۔

یسمع صوت المساحی الخ مساحی مسحات کی جمع ہے۔ پھاوڑے کو کہتے ہیں۔ اور چونکہ رات کا آخری حصہ سکوت اور خاموشی کا وقت ہوتا ہے۔ اس وجہ سے یہ آواز دور سے بھی صاف سنائی دیتی ہے۔ تو ایک اور روایت یہ بھی ہے کہ آپؐ کی تدفین رات کے آخری حصے میں ہوئی۔ کیونکہ اخیر حصہ شب میں پھاوڑوں کی آواز سنائی دیتی تھی۔

حدثنا قتیبہ بن سعید (الی قولہ) قال توفی رسول اللہ ﷺ یوم الاثنین ودفن یوم الثلثاء دراصل منگل اور بدھ کی درمیانی شب کو حضور ﷺ کی تدفین ہوئی تھی۔ جس کو مجازاً یوم الثلثاء یعنی منگل کا دن بھی کہا جاسکتا ہے۔ اور یوم الاربعاء بھی۔ یا یوں کہئے کہ منگل کی شام کو قبر کی کھدائی وغیرہ امور کو شروع کیا گیا اور رات کے آخری حصہ تک تکمیل ہوئی۔ یوں تدفین کی نسبت منگل کے روز کو بھی ہوگئی۔

امامت ابی بکر کا اہتمام | **حدثنا نصر بن علی الجهضمی** (الی قولہ) عن سالم بن عبید قال اغمی علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضور ﷺ کو مرض وفات میں بار بار غشی ہوتی تھی اور جب ہوش آتا تو پوچھتے کہ نماز کا وقت ہوگیا ہے یا نہیں۔ معلوم ہوتے پر فرماتے کہ بلال رضؓ سے کہہ دو کہ نماز کی تیاری کریں اور ابوبکر نماز پڑھائیں

مروا بلالا ان یؤذن الخ حاکم وقت کی ذمہ داری ہے کہ نماز کی اہمیت کے پیش نظر نظام صلوٰۃ نافذ کرے مسجد کا ڈول۔ کوزہ۔ پانی۔ بجلی اور مؤذن وغیرہ کا بندوبست سب نظام صلوٰۃ کا جزو اور حکومت وقت کے فرائض میں داخل ہیں۔ اور حضور ﷺ نے مرض وفات میں بھی اس کا اہتمام رکھا۔ اسی طرح آپ ﷺ نے امام کا تقرر بھی فرمایا۔

ان ابی رجلٌ اسیف۔ صحابہ اگر عزت وجاہ کے طالب ہوتے تو ان میں سے ہر ایک یہ سفارش کرتا کہ میں، میرا باپ۔ یا میرے بھائی بندوں میں سے کوئی امامت کرے۔ لیکن صحابہ رضؓ کا طبقہ اخلاص وللہیت کا طبقہ تھا۔ خود حضرت عائشہ حضور اقدس ﷺ سے ان کے والد کی امامت کروانے کا حکم واپس لینے کی درخواست کرتی ہیں۔ حالانکہ وہ یہ بھی سمجھتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے جسے ہمارے دین کی امامت کے لئے منتخب فرمایا ہے وہی دنیا کے امور میں بھی امامت وقیادت کا حقدار ہوگا۔ گویا یہ امامت امارت دنیوی اور خلافت کی بنیاد بننے والی تھی۔ مگر بایں ہمہ وہ خود کہتی ہیں کہ میرے والد رقیق القلب ہیں۔ بہت جلد غمگین ہونے والے اور نرم دل ہیں اور رسول اللہ ﷺ سے عشق ومحبت بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ لہذا واضح ہے کہ آپ کی جگہ خالی دیکھ کر دل پارہ پارہ ہوجائے گا۔ اور آہ وبکا اس کی نماز میں حائل ہوجائے گی۔ اس لئے ان کی جگہ کسی دوسرے کا تقرر کروا دیجئے۔

صواحب یوسفؑ سے تشبیہ | فانکنّ صواحب یوسف۔ حضور ﷺ کو کچھ افاقہ ہوا۔ تو حضرت عائشہ رضؓ کے اصرار کا جواب دیتے ہوئے اس مطالبے پر خفگی کا اظہار فرمایا۔ حاصل یہ ہے کہ میں نے ایک حکم دیا ہے۔ اب اس میں چون وچرا اور اس پر نکتہ چینیوں کا تمہیں کیا حق حاصل ہے۔ میرے انتخاب میں جتنی حکمتیں ہیں وہ تم کیا جانو۔ لہذا ان باریکیوں اور نکتہ سنجیوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم عورتیں تو وہ لوگ ہو جنہوں نے حضرت یوسفؑ کو بھی مصائب میں ڈالا تھا۔ اور غلط مشورے دئے۔ اسی طرح تم بھی مجھے غلط مشورے دے کر پریشان کر رہی ہو۔

یہاں پر حضور ﷺ نے جمع کا صیغہ استعمال کیا۔ جو یا تو صرف اعزاز وتشریف کے لئے ہے اور معزز ومہذب لوگوں کا طریقہ یہ ہے۔ کہ وہ مخاطب کو جمع کے صیغے سے پکارتے ہیں۔ خواہ وہ مخاطب اس کے بیوی بچوں میں سے

کیوں نہ ہو۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ سفر میں ان کی بیوی جا رہی ہیں۔ مگر وہ کہتے ہیں امکثوا انی انست نارًا لعلی آتیکم (الآیۃ) تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعزازاً اور تشریفاً جمع کا صیغہ استعمال کیا۔ یا اس وجہ سے جمع کا صیغہ لائے کہ حضرت عائشہؓ کی تائید دیگر ازواج مطہرات نے بھی کی تھی خصوصاً حضرت حفصہؓ تو اکثر باتوں میں حضرت عائشہؓ کے ہمراہ ہوا کرتی تھیں۔ اور ترمذی (باب مناقب ابی بکرؓ) کی روایت میں یہ تصریح ہے کہ حضرت عائشہؓ نے حضرت حفصہؓ کے ذریعے بھی یہ بات کہلوائی تھی۔

یہاں پر تشبیہ ایک بے موقعہ بات کہنے اور اس پر اصرار کرنے میں ہے۔ یعنی صواحبات یوسفؑ نے بھی یوسفؑ کے سامنے عجیب چال چلی اور بے جا مطالبے میں زلیخا کی سفارش کر دی۔ اسی طرح حضرت عائشہؓ نے بھی گویا بے محل بات کہہ کر اصرار کیا۔ یا تشبیہ اس میں ہے کہ جس طرح زلیخا نے دعوت کا بہانہ بنایا۔ مگر درحقیقت وہ اپنی سہیلیوں کی طعن و تشنیع کے جواب میں اعتذار اور اپنی مجبوری کا اظہار چاہتی تھی۔ اسی طرح حضرت عائشہؓ بھی بظاہر رقت قلبی کا بہانہ کرتی ہیں مگر حقیقت میں انہیں اس بات کا اندیشہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ کھڑا دیکھ کر لوگ اس کے والد کو منحوس سمجھیں گے۔

نبی کریمؐ کی تاکید پر حضرت ابوبکرؓ نے نماز پڑھانی شروع کر دی۔ ادھر نبی کریمؐ نے خود یہ منظر دیکھنے کے لئے حضرت بریرہؓ اور ایک اور شخص کا سہارا لیا۔ اور مسجد تک تشریف لائے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے سوچا کہ اب تو افضل ترین امام آ چکے ہیں۔ اس لئے نماز میں پیچھے ہٹنے لگے۔ مگر حضورؐ نے آواز دی کہ ٹھہرو اور نماز پڑھو۔ میں تمہاری اقتدا میں نماز پڑھنا دیکھنا چاہتا ہوں۔ ابوبکرؓ نے نماز مکمل کر لی۔ اور رسول اللہؐ نے گویا زبانِ حال سے اعلان کر دیا کہ لوگو! میں نے تمہارے لئے امام اور خلیفہ منتخب کر دیا ہے۔

حضرت عمرؓ حواس گم کر بیٹھے

فقال عمر واللہ لا اسمع احداً الخ عشق و محبت اور دل میں محبوب کی عظمت انتہا کو پہنچ جائے تو انسان کی سمجھ میں محبوب کی موت ناممکن نظر آنے لگتی ہے۔ وہ ہکا بکا اور حیران ہو جاتا ہے۔ حضور اقدسؐ کی حیثیت تو بڑی اونچی ہے۔ ان سے کم تر لوگ بھی مر جائیں تو عقیدت مندوں کو ان کی موت کا اعتبار نہیں آتا۔ اور اس کی قریب ترین مثال امیر المجاہدین سید احمد شہیدؒ کی شہادت کے وقت نظر آ رہی ہے جب اسلام کے کفن بردوش سپاہی اولوالعزمی، عالی ہمتی، جفاکشی اور وفا شعاری کا پیکر بن کر مشرقی ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے درہ بولان کے راستے افغانستان چلے جاتے ہیں۔ پھر وہاں سے بے سروسامانی کی حالت میں درہ خیبر کے ذریعے پشاور آ کر اسے فتح کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد یہ قافلہ مجاہدین پیش قدمی کر کے اکوڑہ خٹک آتا ہے اور یہاں پر سکھ حکومت سے ٹکر ہوتی ہے۔

شہادت سید احمد شہید کا جاں نثاروں پر اثر

مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہم نے یہاں دارالعلوم حقانیہ آمد کے

موقع پر ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ مجھے بہت استقراء و تتبع اور تاریخ کو کھنگالنے کے بعد یہ معلوم ہوگیا کہ گذری ہوئی چار یا پانچ صدیوں سے صحیح اسلامی اصولوں کے مطابق جہاد پورے قواعد شرعی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہاں سے شروع ہوا۔ اتنی طویل مدت کے بعد سید احمد شہیدؒ نے اسلامی قوانین کی پاسداری کرتے ہوئے پہلے دشمن کو دعوت اسلام دی ورنہ جزیہ یا پھر تلوار سے جہاد کے تیار رہو جانے کی اطلاع دی۔ اور جہاد کے تمام مقدمات کی تکمیل کے بعد اکوڑہ خٹک کے مقام پر حملہ کرکے شہداء نے اپنا خون بہایا۔

اس کے بعد سید صاحب اور اس کے ساتھی اکوڑہ خٹک کے مقام پر شبخون کے بعد قریبی گاؤں شیدو آتے ہیں اور وہاں باقاعدہ کافر افواج سے آمنا سامنا ہوتا ہے۔ جنگ کی رات شیدو سے لے کر یہاں اکوڑہ خٹک اور نوشہرہ تک میدانوں میں تقریباً ایک لاکھ فوج خیمہ زن تھی۔ ہائے اللہ چشم فلک نے کیا منظر اس وادیٔ غیر ذرع میں دیکھا ہوگا۔ رات بھر اللہ اکبر کی گونج اور جہاد کے غلغلوں سے کیا سماں رہا ہوگا۔ یہ جو آپ جہاں بیٹھے ہیں اور یہاں کے ارد گرد اطراف میں سب میدان تھے۔ اور اس چپہ چپہ پر اس رات مجاہدین سربسجود ہو کر گڑگڑائے ہوں گے۔ صبح عین جنگ میں غداری ہو جاتی ہے۔ سید صاحب کو جنگ کی رات زہر دلوایا جاتا ہے۔ اور وہ بیمار اور زار و نزار جہاد میں شریک ہیں۔

بڑی مشکل سے انہیں بچا کر دریائے کابل کے اس پار لے جایا جاتا ہے۔ صحت یاب ہو کر آپ بکھرے ہوئے مجاہدین کو پھر سے جمع کر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر توکل کر ---------

پھر سے مجاہدانہ کارروائیاں شروع کر دیتے ہیں۔ یہ تحریک بالآخر آپ کو شہر بالاکوٹ لے جاتی ہے جہاں آپ کا محاصرہ ہو جاتا ہے۔ اور اسی موقعہ پر سید صاحبؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ اور ان کے اکثر جیالے ساتھی جام شہادت نوش فرماتے ہیں۔ مگر سید صاحب اس افراتفری کے عالم میں غائب ہو جاتے ہیں۔ ممکن ہے دشمنوں نے ان کی لاش دریا برد کردی ہو یا کسی مجاہد نے مزید بے حرمتی سے بچانے کے لئے وہیں کہیں دفن کردی ہو۔ مگر آپ کے باقی ماندہ ساتھیوں میں سے کچھ لوگوں نے آپ کی شہادت سے انکار کردیا۔ بلکہ بعض جید علماء اور صاحب فراست لوگوں تک نے آپ کے متعلق غیبوبۃ کا عقیدہ اپنایا۔ اور کہہ دیا کہ سید صاحب مرے نہیں بلکہ بادلوں میں گئے ہیں اور عنقریب واپس آکر ہماری قیادت فرمائیں گے۔ اور کفار کو شکست دیں گے۔ درد جیسے مشہور شاعر نے اسی جذبے کے تحت ہی سید صاحب کے بارہ میں کہا ہے

اتنا پیغام درد کا کہنا جب صبا کوئے یار سے گزرے
کونسی رات آپ آئیں گے۔ دن بڑے انتظار سے گزرے

بہرحال ایسی حالت میں انسان ہکا بکا رہ جاتا ہے۔ رحمت کا دامن ہاتھ سے چھوٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ ہوش و حواس مفقود ہو جاتے ہیں۔ اور عقل حقائق واقعیہ کو ناممکن سمجھنے لگتی ہے۔ تو یہاں حضرت عمرؓ بھی جذبات سے

مغلوب تھے۔ حواس کھو بیٹھے تھے اور حیرت زدگی کی کیفیت سے دوچار تھے۔ ان کے خیال میں ساری دنیا کو اسلام کے جھنڈے تلے لانے سے قبل نبی کریمؐ کی موت ناممکن سی بات تھی۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت عمرؓ حضورؐ کی رحلت کی خبر کو منافقین کی اڑائی ہوئی افواہ سمجھ بیٹھے اور اعلان کر دیا کہ جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کے بارے میں زبان کھولی، اس کی گردن اڑا دوں گا۔ نبی کریمؐ فوت نہیں ہوئے بلکہ اپنے رب سے مناجات کے لئے گئے ہیں۔ اور عنقریب واپس آکر ان منافقین کے ہاتھ پاؤں قطع کریں گے جنہوں نے آپ کی موت کی خبر پھیلائی ہے۔ آپ کی تقریر سن کر بعض لوگ آپ کے ہمنوا بن گئے اور بعض خاموش ہو گئے۔

قال وکان الناس امیین۔ حضرت سالمؓ اس کی وجہ بیان فرماتے ہیں کہ صحابہ اس دہشت میں کیوں مبتلا ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ لوگ ان پڑھ تھے۔ پیغمبروں اور انبیاء کی حیات و موت کا اس سے قبل دیکھنے کا اتفاق پیش نہ آیا تھا لہذا وہ ناواقفیت کی وجہ سے پریشان تھے۔ مگر بعض ذی ہوش صحابہ نے جب دیکھا کہ حضورؐ کی رحلت کا مسئلہ الجھتا جا رہا ہے تو ان کو ابوبکر صدیقؓ کا خیال آیا کہ وہی امت کو اندھیروں کے اس منجدھار سے نکال سکتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے حضرت سالمؓ کو آپ کے پاس بھیجا۔

انطلق الی صاحب رسول اللہ۔ یہاں پر صحابہ نے بیک زبان صدیق اکبرؓ کو "صاحب رسول اللہؐ" کہا ہے عقل و ہوش کا ماتم کرنے والوں کے لئے مقام تدبر ہے کہ وہ کیسے اس شخص کی صحبت سے انکار کر رہے ہیں جس کی صحبت پر خیر القرون کے چھوٹے بڑوں کا اتفاق ہے۔ اور اسی نام ہی سے اسے پکار رہے ہیں۔ کہ صرف "صاحب رسول اللہؐ" کے الفاظ سے ذکر کئے جاتے ہیں۔

فاتیت ابابکر۔ پہلے گذر چکا ہے کہ ابوبکر صدیقؓ رحلت کے روز جبل سنح گئے تھے وہاں ایک چھوٹی سی مسجد میں آپ بیٹھے تھے۔ حضرت سالمؓ کہتے ہیں کہ میں ان کے پاس روتا ہوا آیا۔ آپ نے دور سے دیکھا تو بات سمجھ گئے۔ اور پوچھا کہ کیا حضورؐ وفات پا گئے۔ حضرت سالمؓ نے کہا کہ مجھے تو یونہی معلوم ہو رہا ہے۔ مگر زبان سے کہہ نہیں سکتا۔ کیونکہ ادھر حضرت عمرؓ کی تلوار کا خوف ہے۔ جو کہہ رہے ہیں کہ جس نے کہا کہ حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا چکے ہیں اس کا سر اڑا دوں گا۔

حضرت ابوبکرؓ حضرت سالمؓ کو لے کر مدینہ آئے۔ حضور اقدس کی جسد مبارک جاں نثاروں میں گھری ہوئی تھی کہا۔ راستہ دو۔ تو راستہ بناتے ہوئے حضورؐ تک پہنچ گئے۔ اور جبین اطہر کو بوسہ دیا۔ اور یہ آیت پڑھی "انک میت وانہم میتون" اس جملہ کے استحضار اور برمحل بیان کی وجہ سے صدیقؓ نے ایک بڑے نزاع کو ختم کر دیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے وفات کی تصدیق فرمائی تو فعلموا ان قد صدق یہ جملہ بار بار آئے گا۔ کہ جب بھی ابوبکر نے کوئی فیصلہ اس سلسلہ میں دیا تو صحابہ کو یقین ہو گیا اور ہر بات پہ اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے کہ بیشک

ابوبکرؓ نے پسح فرمایا۔ اور پھر حضورؐ پر نمازِ جنازہ کی بابت دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ ایک ایک جماعت اندر جاکر آپؐ پر بلا جماعت نماز پڑھ کر باہر آئے۔ اس طرح سب لوگ نماز پڑھیں گے۔ پھر پوچھا کہ کیا آپ دفن کئے جائیں گے۔ فرمایا ہاں۔ پوچھا گیا کہ کہاں؟ فرمایا جہاں وفات ہوتی ہے۔ وہی جگہ آپ کا مدفن ہو گا۔ پھر حضرت ابوبکرؓ نے قریبی رشتہ داروں کو تجہیز و تکفین کے انتظام پر مامور کیا۔

خلافت صدیقی پر اجماع | ادھر خلافت کا مسئلہ چھڑ گیا تھا بات چل رہی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اٹھ کر فرمایا کہ ہم سب میں سے کون ہے جس میں ایک ہی موقع پر تین فضیلتیں جمع ہوگئی ہوں اور وہ منصوص ہوں۔ ایک تو ثانی اثنین اذ ھما فی الغار حضور اقدسؐ کے ساتھ اتحاد و معیت اور بالکل تنہائی کی رفاقت۔ دوسری اذ یقول لصاحبہ کہ خود اللہ تبارک و تعالیٰ ابوبکر کو حضورؐ کا ساتھی اور صحابی فرما رہے ہیں۔ شیعہ لاکھ کہیں کہ وہ صحابی نہیں مگر قرآن نے خود اس بات پر مہر تصدیق ثبت کر دی کہ ابوبکر صحابی ہیں۔ تیسری ان اللہ معنا کہ اللہ تعالیٰ کی معیت ابوبکرؓ کو بھی اس نص سے حاصل ہوئی۔ کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم ہی بتلاؤ کہ وہ دو کون تھے۔ ثانی اثنین میں جن کا ذکر ہے۔ پھر اور بھی گفتگو ہوتی رہی جس کی تفاصیل دیگر روایات سے معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اے انصارِ مدینہ کیا حضورؐ نے ابوبکرؓ کو اپنے مصلّی پر کھڑا کر کے علالت میں نماز نہیں پڑھوائی تھی۔ کیا تم میں سے کوئی یہ گوارا کر سکے گا کہ حضورؐ کے کھڑے کئے ہوئے شخص کو امامت سے ہٹا دے۔ انصار نے فرمایا معاذ اللہ! ہم یہ جرأت کہاں کر سکتے ہیں؟ پھر حضرت عمرؓ نے ہاتھ بڑھایا اور حضرت ابوبکرؓ سے بیعت ہوئے۔ اس کے بعد سقیفہ بنو ساعدہ میں اکٹھے ہوئے سب لوگوں نے بڑی محبت و رغبت سے بیعت کی۔

و بایعہ الناس بیعۃً حسنۃً جمیلۃً یہ ابتدائی بیعت تھی جو مجلس انصار میں ہوئی۔ دوسرے روز مسجد نبویؐ میں بیعت عامہ ہوئی۔ جس میں حضرت عمرؓ نے افتتاحی خطاب فرمایا۔ پھر حضرت ابوبکرؓ نے اپنا شہرۂ آفاق خطبہ دیا۔

حدثنا نصر بن علی (الی قولہ) عن انس بن مالک قال لما وجد رسول اللہ الخ

واکرباہ۔ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنے محبوب والد کی تکلیفیں اور شدائد دیکھیں تو ضبط نہ ہو سکا اور غم و تحسر کا اظہار فرمایا کہ ہائے ابا کی تکلیفیں۔

لا کرب علی ابیک بعد الیوم حضورؐ نے پیاری بیٹی کو تسلی دی کہ یہ شدائد ان نعمتوں کے مقابلے میں ہیچ ہیں جن کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے بہت پہلے ہی " ولسوف یعطیک ربک فترضیٰ " میں فرمایا ہے۔ اب تو دار المحن سے رخصت ہو کر مقام محمود پہنچنا ہے۔ اور رفیق اعلیٰ سے ملاقات کرنی ہے۔ اس لئے آج سے تیرے باپ کی تکالیف کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ تیرے والد پر وہ نہ ٹلنے والی چیز اتری ہے جو قیامت تک کسی سے ٹلنے

"الی نہیں الوفاۃ یوم القیامہ"

غمگساروں کے لئے تسلّی کا سامان | حدثنا ابوالخطاب (الی قولہ) سمع ابن عباس یحدث انہ سمع رسول اللہ ﷺ یقول من کان لہ فرطان من امتی ادخلہ اللہ بھما الجنۃ فقالت عائشۃ فمن کان لہ فرط من امتک قال ولمن کان لہ فرط یا موفقۃ الخ

اس حدیث کا بظاہر وفات النبی ﷺ سے تعلق نہیں لیکن اس باب سے مناسبت ضرور ہے۔ اور وہ یہ کہ اس حدیث میں تسلّی دلائی ہے کہ امت کے لئے جب رحلت النبی کی وجہ سے دکھی ہونا ہے اور یہی کیفیت ہوئی کہ صحابہؓ نے عمر بھر اس دکھ کو سینے سے لگائے رکھا اور جس میت کی تعزیت کے لئے جاتے تو اس کی موت پر تعزیت سے قبل حضورؐ کے فراق پر تعزیت فرماتے تو وفات النبی ﷺ کے بیان کے بعد اس حدیث میں عشاق کے غمزدہ دلوں کے لئے تسلّی کا سامان بھی موجود ہے۔

گویا امام ترمذی یہ بتانا چاہتے ہیں کہ نبی کریمؐ کی رحلت بڑا المیہ، سانحہ کبریٰ اور عظیم حادثہ ہے جس طرح خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"لن یصابوا بمثلی" یعنی میری امت کو بہت سے مصائب پیش آتے ہیں بہت سی محبوب اشیاء سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ مگر میرے فراق جیسا عظیم غم اور میری رحلت جیسی مصیبت کبھی بھی نازل نہیں ہوسکتی۔ مگر امت کے لئے یہ فاجعہ ناقابل برداشت دکھ ہونے کے ساتھ ساتھ رحمت کا ایک ذریعہ بھی ہے۔ وہ یوں کہ جس طرح باپ کو بیٹے کی موت پر صبر کا بدلہ جنت کی صورت میں ملتا ہے۔ یونہی نبی کریمؐ بھی غمزدہ امتیوں کی شفاعت کرکے نجات کا سبب بنیں گے جس کے دو بچے داغ جدائی دے کر ذخیرۂ آخرت بن جائیں یا ایک بچہ بھی تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے والدین کو ضرور جنت میں داخل فرمائیں گے۔

یا موفقۃ یعنی تجھے خیر کی توفیق دی گئی ہے۔ سوالات کے ذریعے بات کی توضیح کرکے کوئی اغماض باقی نہیں رہنے دیتی۔

حضرت عائشہؓ کو اپنی فکر تھی۔ ان کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ لہٰذا یہ سوال کردیا فمن لم یکن لہ فرط من امتک قال فانا فرط لامتی لن یصابوا بمثلی کہ جس کا ایک بچہ بھی نہ مرا ہو تو حضورؐ نے فرمایا کہ میں خود ان کے لئے ذخیرۂ آخرت اور فرط ہوں گا۔ کیونکہ میری جدائی اور وفات کا صدمہ اور رنج والم تو سب سے زیادہ ہوگا۔

اللھم صل علی سیدنا ومولانا محمد وآلہ وصحبہ وسلم!